پاکستان کے حالات

تبدیلی کِس طرح؟

خُرّم مُرادؔ

حالاتِ حاضرہ پر تحریر ۲۰ سال میں پرانی ہو جانا چاہیے، لیکن محترم خرم مراد کی یہ تحریر پڑھیں تو بالکل آج کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کی تشخیص کی ہے اور نسخۂ شفا تجویز کیا ہے۔ لیکن شفا کے لیے شرط نسخے کے استعمال کی ہے۔ [ادارہ]

منشورات

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : پاکستان کے حالات: تبدیلی کس طرح
مصنف : خرم مراد
طبع اول : جولائی ۲۰۰۸ء
تعداد : ۲۰۰۰
کوڈ : 00123

ناشر منشورات
8-E، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790
042-35252210 - 35252211
042-35252194
SMS ur Address:
0332-003 4909, 0320-543 4909
manshurat@gmail.com / @hotmail.com
www.facebook/manshurat
www.pinterest.com/manshurat

مطبع : قومی پریس، ۵۰ لوئر مال، لاہور

قیمت : ۷ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موجودہ پاکستان اور ہماری ذمہ داریاں کے حوالے سے اگر مختصراً جائزہ لیا جائے تو اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلے ایک نظر موجودہ پاکستان پر ڈالنا ضروری ہے، اور پھر اس کے حوالے سے ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ پاکستان اُس پاکستان سے بالکل مختلف ہے جو ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا تھا، جغرافیائی طور پر بھی اور معنوی و روحانی طور پر بھی۔ یہ وہ پاکستان بھی نہیں ہے جس کا خواب دیکھ کر برعظیم کے مسلمانوں نے خاک و خون کے دریا سے گزر کر پاکستان کو وجود بخشا تھا۔ جغرافیائی طور پر اپنے وجود کے لحاظ سے جو پاکستان ۱۹۴۷ء میں تھا، وہ دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ اب اس کا آدھا حصہ ہے جو اس وقت پاکستان کے نام سے موجود ہے۔ اس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ، بلکہ اکثریتی حصہ پاکستان سے الگ ہو چکا ہے۔ جس دھڑ کے دو حصے ہو جائیں وہ خود اپنی جگہ پر اس بات کی علامت ہے کہ وہ شدید انتشار اور مسائل سے دوچار ہے۔

معنوی اعتبار سے جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو عزائم اور امیدوں کے خزانے لوگوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ مگر منزل کی طرف پیش رفت کے لیے جو ہمتیں اور حوصلے اور جو جذبے اور آرزوئیں اُس وقت عوام کے دلوں میں موجزن تھیں۔ آج وہ ناپید ہیں۔ ان کی جگہ ایک مایوسی ہے اور قنوطیت اور بے ہمتی اور بے حوصلگی کی کیفیت ہے۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو اس وقت عزائم بلند تھے، امنگیں توانا تھیں اور بازوؤں اور

دلوں میں جذبہ اور قوت تھی۔ آج جدھر بھی چلے جائیں ـــــ میں نے اس ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا حوالہ دیا ہے ـــــ لوگ سنجیدگی سے پوچھتے ہیں اور ان کو پوچھنے کا حق ہے ـــــ اس لیے کہ ماضی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے ـــــ کیا پاکستان سلامت رہے گا؟ اندر اور باہر کے لوگ بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ اس پاکستان کا سلامت رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

وہ پاکستان جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا کہ یہ ملت اسلامیہ کی امنگوں کا ترجمان اور مظہر ہوگا، یہاں زندگی اس تہذیب وثقافت، اس عقیدے اور ایمان اور اس نظام کے مطابق تشکیل پائے گی جو بحیثیت مسلمان ہمارا نظام ہے، مگر وہ منزل بظاہر آج قریب نہیں بلکہ دور نظر آتی ہے۔

اگر ہم معنوی طور پر دیکھیں تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ ملک ہمارے لیے ایک کشتی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ہم سب کشتی کے مسافر کی طرح سوار ہیں۔ اس کو جو حادثہ پیش آئے گا اس میں ہم برابر کے شریک ہوں گے۔ یہ کشتی ایک ایسے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے کہ اس کا تختہ تختہ ہل رہا ہے۔ جو لوگ اخلاقی اور دینی حوالے سے اپنے آپ کو بلند اور اس کشتی کے پاکیزہ حصے سے متعلق سمجھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ نچلے حصے کے لوگ، اور نچلے حصے سے مراد طبقاتی یا مادی یا علمی نچلا پن نہیں ہے بلکہ اخلاقی اور ایمانی لحاظ سے جو لوگ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس کشتی میں چھید کر رہے ہیں۔ پانی اندر آ رہا ہے، کشتی پانی سے بھر رہی ہے اور جو کشتی پانی سے بھر جائے اس کی سلامتی مخدوش ہو جاتی ہے بلکہ وہ تباہ و برباد ہو سکتی ہے اور سمندر کی نذر ہو سکتی ہے۔

یہی کیفیت ہمارے ملک کی ہے۔ یہ نچلا طبقہ جس میں ان مناصب پر فائز لوگ بھی ہیں جو پاکستان کے اعلیٰ ترین مناصب ہیں، اور اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو لائن مین ہوں یا

میٹر ریڈر، سڑک پر کھڑا ہوا کانسٹبل ہو یا پٹواری جو زمین کی حدود بندی کرتا ہے ـــــ ہر شخص اوران کی بہت بڑی تعداد کشتی میں چھید کرنے میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قانون نام کی چیز کتابوں میں پائی جاتی ہے لیکن قانون کی پابندی سے ہر ایک اپنے آپ کو بالاتر سمجھتا ہے۔ صدرریاست بھی قانون توڑتے ہیں، کمانڈر انچیف بھی قانون توڑتے ہیں، وزیراعظم بھی قانون توڑتے ہیں، سول سرونٹ بھی قانون توڑتے ہیں، اور خود قانون کے محافظ، قانون کے نگراں، قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی قانون توڑتے ہیں۔ قانون شکنی اس ملک کا ایک عام رواج ہے اور قانون کی پابندی ایک استثنا ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

سیاسی طور پر یہ ملک اس قدر غیر مستحکم ہے کہ نصف صدی گزرنے کے باوجود بھی کسی حکومت کے بارے میں یہ اعتبار نہیں ہوتا کہ وہ قائم رہے گی، اور اپنے مقام پر اپنے فرائض انجام دے سکے گی۔ پچھلے چند انتخابات ہمارے سامنے ہیں اور وہ حکومتیں جو کہ بظاہر بڑی مستحکم رہی ہیں جو کہ قوت اور اسلحے کے بل پر قائم ہوئیں، وہ جب رخصت ہوئیں تو ملک کو مزید غیر مستحکم کر کے رخصت ہوئیں۔ سید مودودیؒ کے الفاظ میں گویا کہ مین ہول یا گٹر پر ڈھکن رکھا ہوا تھا اور پانچ پانچ، دس دس سال کے اندر جو گندگی اور سڑاند جمع ہوتی رہی وہ لوگ دیکھ نہیں سکے تھے لیکن جیسے ہی حکمران رخصت ہوئے وہ منظر عام پر آ گئی۔

پہلی ۱۰ سالہ جبری حکومت رخصت ہوئی تو تحفے میں ملک کی تقسیم اور پیپلز پارٹی کی حکومت کا تحفہ دے کر گئی۔ ملک دولخت ہو گیا اور پاکستان کی باگ ڈور پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں آ گئی۔

دوسری حکومت رخصت ہوئی تو مسلسل چھے سال تک زلزلے کا عالم ملک کے سیاسی نظام پر طاری رہا۔ معاشی گرانی اور بے روزگاری نے کمر توڑ کر رکھ دی اور عالمی امداد کی آڑ میں پاکستان کو بھکاری بنا کر رکھ دیا گیا۔

پہلے ہی دن سے گداگری کو پاکستان کا شیوہ بنا دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ

پاکستان بننے کے دو ماہ بعد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا سفیر واشنگٹن خیرات کی درخواست لے کر پہنچا اور اس زمانے میں دو ہزار ارب ڈالر کی امداد دی گئی۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کے ملنے کا خواب بھی آدمی نہیں دیکھ سکتا تھا۔اس کے بدلے میں یہ یقین دلایا گیا کہ اس علاقے میں امریکا کے مفادات کے ہم محافظ ہیں، اور اس کے جو سامراجی بین الاقوامی عزائم ہیں ان کی تکمیل کا ذریعہ بنیں گے۔اس امداد کے لیے جن اشیا کی فہرست دی گئی تھی، اس کو دیکھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسی میں سپاہیوں کی تنخواہیں بھی امداد کے طور پر امریکا سے طلب کی گئی تھیں۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ پاکستان جس بے سروسامانی اور کسمپرسی کے عالم میں وجود میں آیا تھا، ان حالات میں شاید باہر سے امداد لینا ضروری ہوتا لیکن امداد لینے والوں اور خیرات لینے والوں نے امداد کے نام پر اس ملک کی آزادی کو آزاد ہوتے ہی بیرونی قوتوں کے ہاتھ میں گروی اور رہن رکھ دیا۔ سیاسی طور پر ان کا سفیر یہاں کا وائسرائے کہلانے لگا، اور معاشی طور پر امداد کے سنہرے جال میں ہمارا بال بال بندھ گیا۔ یہاں تک کہ آج جو کچھ بھی ہم بجٹ میں بھاری ٹیکس لگا کر وصول کرتے ہیں اس کا بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی میں ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے بجٹ کا یہ بڑا حصہ ابتدا ہی سے ترقیاتی کاموں پر لگاتے تو وہ رقم اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو ہم نے امداد کے طور پر حاصل کی۔ پھر قرض کا یہ تناسب بڑھتا چلا جائے گا اور ایک وقت آئے گا کہ شاید پوری آمدنی دے کر بھی ہماری جان نہیں چھوٹے گی۔

دوسری طرف اس الزام کے باوجود کہ ہم بجٹ کا ۷۳ فی صد اسلحے اور فوج پر خرچ کرتے ہیں، یہ حقیقت تاریخ کے صفحات کے اندر موجود ہے کہ ہر سال اپنا پیٹ کاٹ کے تعلیم کو قربان کر کے، صحت کو قربان کر کے اور پائی پائی جوڑ کے ہم فوج کی صورت میں جو قوت پالتے رہے ہیں، وہ ہمارے ملک کو دو ٹکڑے ہونے سے نہیں بچا سکی۔ شروع سے لے کر آج تک کے کمانڈر انچیف واشنگٹن 'حج' پر جاتے ہیں اور وہاں کے 'باب ملتزم' سے چمٹ کر امداد کی درخواستیں کر کے، امداد لے کر واپس لوٹتے ہیں۔

ہماری نیوکلیئر پالیسی ہو یا کشمیر پالیسی یا افغان پالیسی، سب پر امریکا کی نظر ہے۔ ہمارے سر پر تلوار لٹکتی رہتی ہے کہ ابھی ہم نے تمھیں دہشت گرد قرار نہیں دیا لیکن اس تمام تر صورتحال پر ہم گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہر دو ہفتے یا ایک ماہ بعد یہ خبر آتی ہے کہ اب ملک کو دہشت گرد قرار دیا جانے والا ہے۔ اس پر ہم اور ہمارے حکمران کانپ اٹھتے ہیں، اور پھر اطمینان دلایا جاتا ہے کہ نہیں ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ مسلسل خوف میں رکھنا ٹارچر اور تعذیب کا ایک بڑا معروف طریقہ ہے۔ اپنی مرضی کے کام کرانے کے لیے ہلاک کرنے سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا مسلسل خوف اور ڈر کے اندر مبتلا رکھنے سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد آدمی زیادہ فائدہ دیتا ہے، اور وہ سب کام کرتا ہے جو کہ کرانے والا چاہتا ہے۔

ہمارے ملک کے اندر خوں ریزی اور قتل و غارت کا جو بازار گرم ہے، یہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس امت کو جو نصیحتیں فرمائی تھی کہ تمھارے مال، تمھارے خون اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی، اس شہر کی اور اس مہینے کی حرمت ہے، اور دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ پنجابی ہو یا بنگالی، عرب ہو یا ترک، یمن ہو یا مصر، شام ہو یا عراق...... کبھی حجاج بن یوسف جیسے حکمرانوں کے ہاتھوں اور کبھی آپس میں نسلی اور لسانی تفرقوں کے ہاتھوں، جب کہ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر زبان، نسل اور رنگ کی خاطر کلمہ پڑھنے والے ایک دوسرے کا خون بہانے کے اندر مصروف ہیں۔ اس میں ریاستی ادارے، فوج اور پولیس، ڈکٹیٹر اور حکمران اور عام آدمی، سب ہی شامل ہیں۔ فرقہ واریت کی خاطر خون بہانا بالکل ایک عام رواج بن گیا ہے۔

اس مرض کی جڑ کی نشان دہی بھی نبی کریم ﷺ نے فرما دی ہے۔ اس کے مطابق تنگ دلی اور دنیا سے محبت، دینے سے انکار اور لینے پر اصرار، اور لینے میں حق سے زیادہ لینے کی فکر اور

دیتے ہوئے کم دینے کی روش، یہ سب اس مرض کی علامات ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی نشان دہی یوں کی ہے:

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَo (المطففين ۸۳: ۲-۳)

جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔

ان سب امراض سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس لیے بھی کہ انھی امراض نے پہلی قوموں اور امتوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے اللہ نے جو حرمتیں قائم کر دی ہیں، یعنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت، ان کو حلال کر دیا۔

یہ مرض تو رگ رگ اور ریشے ریشے میں پھیل چکا ہے۔ مغربی تہذیب دنیا کی محبت اور زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کا نام ہے۔ اسی لیے مغرب دجّال کی یہی جنت لے کر آیا کہ اگر انکار کرو گے تو پستی، پسماندگی اور افلاس کی جہنم میں جلو گے اور ایمان لاؤ گے، تو ہماری ترقی کے نظارے دیکھو گے۔ یہ موٹروے، یہ کارخانے، یہ ٹیلی ویژن اور بے شمار سائنسی ایجادات اسی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ گویا معاشی ترقی ہی سب کچھ ہے۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ اول جماعت سے انگریزی پڑھو گے تو ترقی نصیب ہوگی، کارخانے بناؤ گے تو معاشی بہبود نصیب ہوگی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ۴۰ سال کی معاشی ترقی کے بعد بھی لوگ ویسے ہی غریب، پسماندہ اور جاہل ہیں۔ انگریزی پڑھ کے نہ ہم نے وہ سائنٹسٹ پیدا کیے اور نہ وہ علما، نہ وہ فلاسفر پیدا کیے اور نہ وہ مفکرین جو مغرب پیدا کر رہا ہے۔ گویا تعلیم میں بھی افلاس سے دوچار ہیں اور معاشی طور پر بھی افلاس اور بدحالی میں مبتلا ہیں۔

مغرب نے معاشی ترقی کو دیوی بنا کر اس کی پرستش کی ہے۔ یہ وہ سونے کا بچھڑا تھا

جو مغرب کے سامری نے گھڑ کے ہمارے سامنے رکھ دیا اور مسلمان ملت ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اس کی پرستش میں مصروف ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ امت بنی ہی اس لیے تھی کہ کارخانے بنائے، اور مال و دولت جمع کرے۔

جب مال بنانے کی حرص و حوس اور دینے میں بخل اور کنجوسی اور اغراض رگ رگ میں پھیل جائے تو پھر یہ باہمی افتراق و انتشار اور پستی و بدحالی کا سبب بنتے ہیں۔ جب معاشی ترقی ہی حاصل ٹھیری تو پھر ذاتی اغراض اور مفاد ہی مقدم ہوتے ہیں۔ پھر شاید میرے محلے، میری نسل اور میری قوم کی بات بہت دور جا کر آخر میں کہیں آتی ہے۔ آج جو خوں ریزی پائی جاتی ہے اس کی جڑ بھی اسی میں موجود ہے۔

مختصراً میں نے آپ کے سامنے موجودہ پاکستان کا نقشہ کھینچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد
کجا کجا نہم

گویا پورا جسم زخموں سے چور ہے، آدمی مرہم کہاں کہاں رکھے، کس کس طرف آدمی انگلی اٹھائے کہ یہ اور یہ جرائم ہیں۔

بظاہر جو پڑھا لکھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جس سے ہم اور آپ بھی متعلق ہیں، وہ چند ایک شعبوں میں کامیابی سے ہم کنار ہونے کے بعد سمجھتا ہے کہ ہماری ذمہ داری ادا ہوگئی۔ لیکن یہ رویہ انبیا علیہم السلام کی روش نہیں تھی۔ ان کی قومیں جس جاہلیت کے اندر مبتلا تھیں وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ بسا اوقات ایک بھی صاحب خیر مشکل سے نظر آتا تھا۔ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ o (ھود ۱۱:۷۸) کی صدا وہ بلند کرتے تھے لیکن ایک بھی آدمی نہیں ملتا تھا جو صحیح بات کہنے والا ہو۔ حتیٰ کہ ایک ہزار سال کی دعوت اور جدوجہد کے بعد بھی وَمَآ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ o (ھود ۱۱:۴۰) کا منظر ہوا کرتا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ مایوس نہ ہوئے بلکہ اپنی قوم کے درد اور سوز میں

تڑپتے تھے، مضطرب رہتے تھے کہ کسی طرح قوم صحیح راستے پر آجائے۔ بُرا بھلا کہہ کر مرثیہ پڑھ کر بیٹھ نہیں جایا کرتے تھے، بلکہ ان کی روش تو یہ تھی:

فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَo (اعراف ۷:۹۳)
اب میں اُس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے۔

یہاں تک کہ جب عذاب کی آخری گھڑی بھی آجاتی تو کہتے تھے کہ ہم نے تو نصیحت کی کوشش کی اور روتے ہوئے رخصت ہوا کرتے تھے کہ قوم کا یہ انجام ہوا۔ لہٰذا قوم کو برا بھلا کہنے یا مرثیہ پڑھنے سے ہماری اور آپ کی ذمہ داری ادا نہیں ہوتی۔ ماضی کے جائزے اور مسائل کے تذکرے کا بنیادی مقصد اس بات کا احساس دلانا ہوتا ہے کہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق: **کلکم راعٍ و کلکم مسؤل عن رعیتہٖ** ، تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

اس لیے وہ لوگ جن کے پاس دین کا فہم اور، دین کا علم ہے اور جنھوں نے دین کے لیے حلف اٹھایا اور عہد کر رکھا ہے ان سے بڑھ کر کون راعی ہوگا، اور ان سے بڑھ کر کس کو اپنی رعیت کا سوز اور درد و غم ہونا چاہیے۔ ان کو تو گھلنا چاہیے یہاں تک کہ گلا گھٹنے لگے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی حزن کی کیفیت تھی۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَo (یٰسٓ ۳۶:۷۶)
اچھا، جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمھیں رنجیدہ نہ کریں، ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔

یہ اس کیفیت کی عکاسی ہے جو حضور ﷺ کے اوپر طاری تھی۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ جب میری قوم نے میرا انکار کر دیا اور مجھے نکال باہر کیا تو پھر اس کا مقدر ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ ہم تو اس مقام پر بھی نہیں ہیں۔ یہ تو انبیا کی خصوصیت ہے کہ جب ان کی قوم رد کر دے تو قوم

ہلاکت و تباہی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پہنچانے کا حق اور ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ لیکن یہ ہماری اور آپ کی ذمہ داری ہے۔ اللہ نے جن کو دین کا علم اور دین کا فہم دیا ہے، سب سے پہلے ان سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ہم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس کی فکر ہونی چاہیے اس لیے کہ لوگ اس بنیاد پر ہماری گردن پکڑ سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے وہ جن کے پاس علم ہو اور جو اس کو دوسروں تک نہ پہنچائیں اور اس کا حق ادا نہ کریں جیسا کہ اس نے سب سے عہد لیا ہے کہ اسے لوگوں تک پہنچائیں اور اس کو بیان کریں، ان کے بارے میں بڑی وضاحت سے فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ o اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ o اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ o خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ o (البقرہ ۲:۱۵۹-۱۶۲)

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر

اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کو سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔

قرآن مجید میں اس امت کو شہادت حق کے منصب پہ فائز کیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''امتِ وسط'' بنایا ہے، تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

اور اس کی تعبیر بھی سامنے رکھ دی ہے۔ اب سب سے بڑھ کر یہ ہمارے پاس امانت ہے، اور ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ یہ قوم جو تباہی کے کنارے لگ چکی ہے، وہ کشتی جس کا تختہ تختہ اس طوفان نے ہلا کر رکھ دیا ہے، اس کی سلامتی کے لیے ہم اٹھ کھڑے ہوں اور اپنا حق اور فرض ادا کریں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر ہم ایک ایک زخم کے اوپر مرہم رکھتے جائیں گے، اور ایک ایک پھوڑے کا علاج کریں گے تو دوسرا نکل آئے گا، اور گذشتہ ۴۵ سال سے ہم یہی منظر دیکھ رہے ہیں۔ حالات کو بہتر کرنے کے لیے اور قوم کی قسمت سنوارنے کے لیے مدعی آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ کوشش کرتے ہیں مگر جب جاتے ہیں تو قوم کی قسمت مزید بگڑی ہوئی ہوتی ہے، حالات مزید خراب ہو چکے ہوتے ہیں۔

دراصل ہمیں مسائل کی جڑ تک پہنچنا چاہیے اور امراض کی جڑ دلوں میں ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ ۲:۱۰)

ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج ۲۲:۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں

میں ہیں۔

وہ سب قوتیں اور عناصر جو اس ملک کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں، جو اس دھرتی کے سینے میں چھید کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جو ملکی وسائل اور خزانے کو لوٹنے میں لگے ہوئے ہیں، جو ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں خوب دیکھ رہی ہیں، ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں، ان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں۔

یہ دلوں کا اندھا پن زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی ہوس اور نہ دینا، روکے رکھنا، جمع کرنا، گن گن کے رکھنا اور حق نہ ادا کرنے کا نتیجہ ہے۔ سیاست میں کسی دوسرے کو جگہ نہ دینا، ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا، رواداری کا مظاہرہ نہ کرنا، اس کی بنیادی وجہ دل کی تنگی، بخل اور کنجوسی ہے۔ جب دل کھلتا ہے تو مال و دولت بھی آدمی دونوں ہاتھوں سے دیتا ہے۔ پھر غصے، نفرت اور انتقام کے طوفان بھی دل کے اندر سما جاتے ہیں اور تھم جاتے ہیں۔ اہل ایمان کی حقیقت تو یہ بتائی گئی ہے:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (آل عمرٰن ۳:۱۳۴)

جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوشحال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

یہ دونوں صفات ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ آدمی سخی ہو اور دل کا تنگ بھی ہو، معاف کرے اور انتقام بھی لے۔ لیکن یہاں تو دونوں طرح کی کنجوسی اور بخل چھایا ہوا ہے۔ اس کی چربی دل کی آنکھوں پر چڑھ گئی ہے۔ اس نے دلوں کو اندھا کر دیا ہے۔

ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم دلوں کو جگائیں، دلوں کو بیدار کریں، دلوں کی بستی کو آباد کریں۔ ان میں خدا کی محبت پیدا کریں اور دنیا سے بے نیازی پیدا کریں۔ اس کے بغیر اس قوم کی

اصلاح نہیں ہوسکتی۔ہم چاہیں کہ اوپر سے کوئی لیپ پوت کر کے یہ قوم صحیح راہ پہ آ جائے،تو ایسا نہیں ہوسکتا۔دلوں کے اوپر جو تالے پڑے ہوئے ہیں،ہم اگر ان کو ایمان اور خدا کی محبت کی کنجی سے نہیں کھولیں گے تو قوم کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس قوم میں بے پناہ قوت کے خزانے پوشیدہ ہیں۔یہ کام ہے جو ہمارے آپ کے کرنے کا ہے۔

ہزار وعظ کیے جائیں کہ یہ غلط ہے اور وہ صحیح، یہ کرو اور وہ نہ کرو،مگر جن کے دل پتھر کی طرح سخت ہو چکے ہوں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا پتھروں سے بھی چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور پانی رسنے لگتا ہے، اور خدا کی خشیت اور خوف سے بھی پتھر گر پڑتے ہیں، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں مگر جو دل پتھر سے زیادہ سخت ہوں ان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہو جاتا ہے۔ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المائدہ ۵:۱۳)

پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اوران کے دل سخت کر دیے۔

قرآن نے اس کی وجہ صاف بیان کر دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وعظ بھی ہوتے ہیں، درس بھی ہوتے ہیں،قرآن بھی پڑھے جاتے ہیں،دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں لیکن اثر نہیں ہوتا، پتھروں سے پانی نہیں بہتا،اس لیے کہ دل تو پتھر کی طرح سخت ہیں۔

یہی ایک نسخہ ہے جس سے پوری قوم کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔جب کسی قوم اور افراد کے سامنے کوئی مقصد ہو اور کسی چیز سے محبت ہو تو اس کے بعد ہی اصلاح ممکن ہوتی ہے اور کسی کو عمل پر ابھارا جاسکتا ہے۔اگر ہم چاہیں کہ ایسا محض وعظ ونصیحت اور علم وشعور سے ہو جائے تو ایسا ممکن نہیں۔اس لیے کہ علم تو شیطان کے پاس بھی بہت تھا۔علم تو مستشرقینِ اسلام کا بھی بہت ہے۔ علم کی ضرورت واہمیت اپنی جگہ،لیکن علم کے ساتھ دل کی بیداری بھی ضروری ہے۔علم کی امانت

ہمارے پاس ہے مگر علم خود فی نفسہ کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ بڑے بڑے علما گزر گئے مگر جن کے دل سخت تھے ان کا کچھ نہیں کر سکے، اپنی قوم کو کچھ نہیں دے سکے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست

گویا قوموں کی زندگی اگر باقی رہتی ہے تو مقصد سے وابستگی، مقصد سے محبت اور لگن سے باقی رہتی ہے۔

جب ہم قوم کو اُس مقصد کے لیے بیدار کر دیں، اُس راہ پر لگا دیں اور اُس مقصد سے وہ چمٹ جائے، جو مقصد اللہ کے عہد کے حوالے سے ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے، تو اس کی زندگی کو بقا مل سکتی ہے۔ یہ عہد اور مقصد ایک لنگر اور پتوار ہے جس سے طوفان میں ڈوبتی کشتی بچ سکتی ہے، اس کا تختہ تختہ ہلنا بند ہو جائے گا، اور پھر اس کے بعد یہ اپنی منزل کی طرف بڑھے گی۔

ہم اگر اور کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم یہ آرزو اپنے دلوں کے اندر زندہ رکھیں اور دوسروں کے دلوں کے اندر بیدار کر دیں اور اس کی جستجو اور سعی میں لگے رہیں ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

جستجو ہی زندگی کا راز ہے زندگی تو اسی میں ہے کہ آدمی جستجو میں لگ جائے، یہ کام کر جائے، اس مقصد کے لیے تگ و دو کرے، اور اسی کی آرزو دل میں سلگتی رہے ؎

آرزو را در دِلِ خود زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

لہٰذا اس آرزو کا چراغ کم از کم دل میں جلائے رکھو، اس آرزو کو دل میں سلگنے دو۔ اگر یہ

بھی ختم ہوگئی تو پھر یہ مٹھی بھر مٹی کے پتلے چلتی پھرتی قبریں بن جائیں گے۔

حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر کہا کرتے تھے کہ تمھاری مثال تو ان قبروں کی طرح ہے جن کے باہر تو سفیدی کر دی گئی ہے، اور اندر گندگی اور مردہ ہڈیاں اور خون اور پیپ جمع ہے۔ آج امیر طبقوں سے لے کر نچلے طبقوں تک وضع قطع، کلام، سب کچھ دیکھ لیں، ان کی کیفیت ایسی ہی ہے۔

موجودہ حالات میں بگاڑ کو روکنے اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے دراصل یہی ایک راہ ہے اور یہی ہماری ذمہ داری ہے۔ میں نے آپ کے سامنے کوئی لمبی چوڑی فہرست نہیں پیش کی بلکہ اصلاحِ عمل کے لیے لوگوں میں خدا کی محبت جگانا اور دنیا سے بے نیازی پیدا کرنی ہے۔ یہی کرنے کا کام ہے اور اسی میں آج کے پاکستان کی بقا اور نجات ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❖❖❖